

ہیں اور کبھی کوئی دارو اور بوٹی لے کر بھی اترتے ہیں اور چاند جب پورا ہو تب آتے ہیں اور پھر مست ہو کر ادھر شور مچاتے ہیں... پھر ہمارے ناں مہانوں کے ان داتا ڈیرے بھی تشریف کرتے ہیں تو حکم فرماتے ہیں کہ اپنی عورت لاؤ... تو ہم لا دیتے ہیں۔“

”زبردستی کرتے ہیں؟“

”ناں سائیں زبردستی کس بات کی.. یہ ہمارے بھاگ کہ وہ حکم فرمائیں.. ہمارا کیا جاتا ہے سائیں.. عورت کا کیا جاتا ہے.. نہاد صو کے پھر سے کھڑی ہے.... جدھر ہمارے چہر اور کشتیاں ہیں یہ کنار ملکیت میں ہے ان کی.. ہم سے کوئی لگان تو نہیں لیتے سائیں‘ مہربانی کرتے ہیں.. چلتے ہیں سائیں نہیں تو سورج تو جاتا کھڑا ہے..“

”چلو...“

اور وہ انڈس کوئین کے وجود سے جڑے آہنی زینے کو تھامتے نیچے کھیت میں اتر آئے.. دھوپ کی تپش میں کمی آچکی تھی..

”ویسے ایک بات ہے سائیں.. میرا باپ جب بوٹی پی کر مست ہوتا تھا تو بولتا تھا کہ یہ جو کشتی برباد کھڑی ہے.. ہمیشہ ادھر نہیں ہوتی... بہت برس گزرتے ہیں ناں تو ادھر سے ٹھل کر سندھ سائیں میں اتر جاتی ہے..“

”کیا؟“

”ہاں سائیں.. میرا باپ بوٹی پی کر جھوٹ نہیں بولتا تھا..“

دوپاؤں جو مرغابی کے سیاہ پنوں کی طرح چپٹے تھے کشتی کے کنارے پر دوڑتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

بس دوپاؤں.. جیسے ان کے اوپر کوئی دھڑنہ ہو صرف دوپٹلی چھمک ڈبلی ٹانگیں ہوں۔

صرف دوپاؤں جو کشتی کے بالشت بھر چوڑے فٹ پاتھ پر دوڑتے جا رہے تھے۔ یقیناً ان دوپٹلی چھمک ڈبلی ٹانگوں کے اوپر سرور کا سیاہ لشک مارتا بدن 'اس کی پسلیاں' روشن دیئے جلتی آنکھیں اور وہ مختصر لنگی بھی تھی جو اس کے جیسے کو چھپاتی نہ تھی، بچوں ایسی چھوٹی پیٹھ کی سختی کو چھپاتی نہ تھی کہ وہ ایک جنور کا بدن تھا جو چھپائے نہیں چھپتا.. ان پاؤں کے پہلو میں ایک لمبا بانس ترچھا ہوتا تھا اور اس پر سرور کی انگلیاں سیاہ ٹیکڑوں کی طرح پیوست تھیں، جو ٹکوں کی مانند چٹائی ہوئی تھیں۔

بانس سندھ کے پانیوں کی تہہ میں ٹھوکر کھا کر مضبوط ہوتا تھا قائم ہو جاتا تھا تو سرور کے بدن کے زور سے کشتی آگے آگے ہوتی چلی جاتی تھی..

اس کے پاؤں کا جوڑا کشتی کے چوبی کناروں پر جتنا اگلے حصے سے دوڑتا ہوا پھلے حصے تک پہنچتا تھا وہاں سرور بانس کو پانی سے نکالتا تھا اور پھر اطمینان اور دھیرج کے ساتھ بانس درست کرتا واپس ہو جاتا تھا..

کشتی کے تختہ فرش کو مہانوں کی بھٹی ہوئی دریاں اور غلیظ گدے ڈھکتے تھے اور خاور ان پر لیٹا ہوا کہ بہر حال وہ اس کی سخت ہوتی کمر کو کسی حد تک آرام میں رکھتے تھے اوپر دیکھتا تھا تو اسے کشتی کی چھت اور نچلے حصے کے درمیان میں بس یہی دوپاؤں دوڑتے پھر

اطمینان سے لوٹے نظر آتے تھے.. اور کبھی کشتی ذرا ڈولتی تو ان کے درمیان میں سندھ کے پانی جھلک دکھا کر پھر نیچے ہو جاتے تھے..

کشتی کی پشت پر جو چوہی ٹکون پانیوں سے بلند ہوتی تھی اس پر سرور کا اماں جعفر کوٹھ مار کر بیٹھا ایک چوڑے چپو کی مدد سے اس کے بہاؤ کی سمت سیدھی رکھنے کی سعی کرتا تھا۔ اگلے حصے میں وہ دکھائی تو نہ دیتی تھی لیکن پکھنٹی تھی جواب بھی اپنے سیاہ لوتھڑے بچے کے گنبے سر کو اپنی چھاتیوں میں دیئے بیٹھی تھی اور کبھی کبھار ”ہو سرور!“ کی بیٹھی ہوئی آواز سنائی دیتی اور پھر اپنی زبان میں اسے کبھی ڈانٹتی اور کبھی نرمی سے پکارتی۔ کشتی کی چھت سرکنڈوں کی تھی جسے ایک ترپال سے ڈھانپا گیا تھا تاکہ دھوپ اور بارش سے بچاؤ ہو..

اور وہ بوندیتی خستہ حال دریوں اور گدوہوں پر دراز... سر تلے بازو رکھے دراز... سرور کے بچہ نمپاؤں کو دوڑتے واپس آتے ایک تسلسل کے ساتھ دیکھتا جا رہا تھا اور کشتی کے پانی پر سرکنے کا احساس اس کے پورے بدن میں آہستہ آہستہ سرکنا تھا۔

گہرے پانی میں داخل ہونے پر سرور بانس اٹھا دیتا اور کشتی بہاؤ کے زور میں بہنے لگتی..

کشتی کے اندرون میں وہ نہ آتے تھے نہ ہی جھانکتے تھے..

یہ صاحب کا علاقہ تھا اس کا کمرہ اس کی خلوت گاہ تھی..

کھلی فضا دھوپ اور پانی کی قربت ان کی تھی..

نہ وہ صاحب کو جانتے تھے کہ وہ کون ہے کہاں سے آیا ہے کیا کرتا ہے.. اور نہ وہ ان سے واقف تھا.. وہ چند روز کے لیے اس کے کامے تھے، کتنے روز کے لیے.. یہ وہ نہیں جانتے تھے.. کشتی سمیت وہ اس کی ملکیت میں تھے.. وہ صرف سائیں برمانی کو جانتے تھے جس نے انہیں مناسب پیشگی دی تھی اور حکم دیا تھا کہ صاحب کو سائیں سندھ کے اندر لے جاؤ... سردلوں کے ذخیروں اور ریت کے ٹاپوؤں میں جہاں سائیں بولے اور رات کرو اس کے روٹی پانی کا دھیان رکھو اور خدمت کرو..

کتنے روز کے لیے؟.. سرور نے پوچھا تھا۔

یہ مجھے بھی نہیں معلوم... سائیں برمانی نے کہا تھا.. جب تک صاحب نہ کہے تب

تک تم نے پانیوں میں ہی رہنا ہے واپس نہیں آنا۔

صاحب شکار کا شوق رکھتا ہے اس لیے جاتا ہے تو ہم اسے خوش کر دیں
گے.. بندوق تو رکھی کھڑی ہے کشتی میں اور کار تو س بھی ہیں..

ناں.. صاحب کو شکار کا شوق نہیں...

پر ہم صاحب کو مرغابی، جل نکلز اور سرخاب کھلائیں گے مار کر....

ناں... سائیں برمانی نے سر بلایا تھا..

یہ عجیب ڈھنگ کا صاحب تھا.. اگر شکار میں شوق نہیں ہے تو اپنا گھربار چھوڑ کر
اوجھر کشتی میں فضول رہنے کو کیوں آگیا ہے... جب پالا پڑنے لگتا تھا تو سندھ کے نیلے اور ناپو
پرندوں سے بھر جاتے تھے.. اور پھر اکثر کوئی وڈیرہ سائیں اور اس کے یار بلی رات دو رات
کے لیے اسے اور اس کی بیڑی کو دریا کے اندر لے جاتے تھے.. دن کے وقت پرندے مارتے
تھے اور رات کو دار و اور بوئی پی کر مست المست ہوتے تھے... اور پھر وہ کچھنی پر نظر رکھتے تھے
اور وہ انہیں رکھنے دیتا تھا..

غازی گھاٹ واپسی پر وہ اسے کبھی کچھ انعام دے دیتے تھے اور کبھی اس کے ہاتھ
خالی رہ جاتے تھے پر وہ دانت نکالتا ان کے سامنے اپنے پورے بدن کو کتے کی دم کی طرح ہلاتا
انہیں رخصت کرتا تھا 'شکایت نہیں کرتا تھا.. وڈیرے سائیں جو تھے ان کی برکت اور
مہربانی سے ہی تو وہ اوجھر چھپر بنائے کھڑے تھے.. کشتیوں کے گھربانیوں میں رکھتے تھے.. وہ
اسے اور اس کے قبیلے کو بے گھر بھی کر سکتے تھے.. پر وہ ڈیجر مہربان اور خدا ترس لوگ تھے
ایسا نہ کرتے تھے..

اگر وہ خالی ہاتھ رہتا تو کچھنی خالی نہ رہتی.. وہ اسے کچھ نہ کچھ دے کر جاتے... کبھی
روپیہ پیسہ اور کبھی کوئی جھکا یا لنگی...

یہ صاحب جو ہے تو شکار کا شوق نہیں رکھتا.. پر کچھنی کا شوق تو رکھے گارب

چاہے..

کچھنی نے بچے کے سر پر دباؤ ڈال کر اس کے منہ کو اپنے تھن کے قریب کیا..
سندھ سائیں پر سے آنے والی ہوا اس کے گریبان میں اڑ سے ہوئے جھگٹے میں سے
گزرتی اس کی چھاتیوں کے ماس پر پھیلی تھی تو ان کے لٹوں کو نپلوں کی طرح پھونکتے تھے اور

پورا بدن دودھ بھر اور پانیوں کی بانس سے رچ جاتا تھا.. یہ پانی کی نمی میں گندھی ہوئی ہوا ایک جاندار وجود کی مانند اس کی ڈھیلی شلوار کے پائینوں میں سرسراتی جاتی تھی اور اس کی ٹانگوں پر اپنا لمس پھیلاتی اس کی کوکھ میں ہریالی بھرتی تھی..

سندھ سائیں کی ہوا اس کے گھروالے کی طرح اس کے بدن پر نچھاور ہوتی تھی اور اسے مست کرتی تھی اور اسی مستی میں وہ اپنے بچے کے سر پر مزید دباؤ ڈال کر اسے اور قریب کرتی تھی...

سرور کے ہاتھوں میں تھا ہوا بانس سندھ سائیں کے سینے میں اترتا جاتا تھا، تہہ کو جا لگتا تھا اور سرور اپنا پورا بوجھ ڈال کر اسے دھکیلتا کشتی کو کھیلتا جاتا تھا.. پھر اس بانس کو پانیوں سے نکال کر کناروں پر آہستہ آہستہ چلتا اس کے پاس آ کر کتا تھا..

صاحب کشتی کے اندر لینا ہوا تھا.. جانے آنکھیں نوٹ کر سوتا تھا یا آنکس میں لینا سرور کے دوڑتے پاؤں کو دیکھتا تھا.. صاحب ذرا وڈیری عمر کا تھا.. اس کا جتنے شہریوں کی طرح بے ڈھنگ اور ایک لمبائی کی طرح ذرا بے ڈول تھا.. سرور یا اماں جعفر جیسا پتلا چھمک چھریا نہ تھا.. مہنگی مہنگی خوراکوں سے پلا ہوا تھا.. صاحب ہر روز مرغی اور پلاؤ کھاتا ہو گا ناں... ہماری طرح مر جیں کوٹ کر سوکھی روٹی تو نہیں کھاتا ہو گا.. پتلے چھمک جتنے والے مرد کا تو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ تم پر ہے یا نہیں.. پر یہ شہری بہت بوجھ ڈالتے ہیں..

صاحب نے ابھی تک اس پر وہ نظر نہیں ڈالی تھی.. اس لیے تو نہیں کہ وہ وڈیری عمر کا تھا.. عمر کے بڑھنے سے طبع حرص سے خالی تو نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہے..

اسے یقین تھا کہ وہ اس پر وہ نظر ڈالے گا.. نہیں تو اس کے پھیرے کا فائدہ... پر آج تک اس کا کوئی پھیرا خالی تو نہیں گیا تھا.. گہرے پانیوں کے بعد یکدم کشتی کا وجود تہہ کو جا لگا اور اس کی ریت پر گھسنے لگا اور سرور نے پھر بانس اٹھا لیا..

اس جھٹکے کی وجہ سے خاور نے اپنا بازو سمیٹا اور اٹھ کر بیٹھ گیا.. کشتی تہہ کی ریت میں اکتی اور گھسنتی ہو لے ہو لے آگے ہوتی تھی..

سرور کے پاؤں اب بھی چوٹی پر جتے دوڑتے تھے لیکن ان کی رفتار گہرے پانیوں کی نسبت اب بہت کم ہو چکی تھی بلکہ وہ دوڑنے کی بجائے چلتا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ جانے کی وجہ سے اب وہ سندھ کے ریتلے کناروں کو دیکھ سکتا تھا جن پر اگے سروٹ اور جنگلی جھاڑیاں کشتی کے بہاؤ کی مانند ایک ایک کر پیچھے رہتے جاتے تھے۔

اس سفر کا جواز کیا ہے؟

کشتی کی ہر ایک ہر جھٹکے کے ساتھ یہ سوال دوہرایا جا رہا تھا۔ کیا ہے... کیا ہے... غازی گھاٹ کے کناروں سے جدا ہوتے ہی اس سوال نے ہزاروں بار اپنے آپ کو دوہرایا تھا۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی مانند مسلسل دستک دیتا تھا اور دروازہ کھلتا نہ تھا کہ اس کے پیچھے جھانک کر پتا چلے کہ جواب کیا ہے۔ شاید زندگی کا جو جواز ہے.. اگر ہے.. تو وہی اس آبی سفر کا جواز ہے.. اگر ہے۔

آج دوپہر وہ ایک کھڑکھڑاتی ٹویوٹا میں چوٹی زیریں کے گاؤں سے.. کوہ سلمان کے دامن سے.. غازی گھاٹ تک آئے تھے..

چوٹی زیریں میں عباس برمانی کا ڈیرا تھا جسے وہ کُنچ کہتا تھا۔ ایک جوہڑ نما تالاب کے کناروں پر سفیدے اور کھجور کے درخت اونچے ہوتے چلے جاتے تھے اور ان کے سائے میں اگرچہ ان کا سایہ بے برکت ہوتا ہے اناروں اور مالٹوں کے ٹھنڈے پیڑ تھے جن کے پھولوں کی کھٹی مہک شام کو تیز اور تند ہو کر اُس تالاب کے ایک کونے میں.. انگور اور بکین ولیا کی بیلوں سے ڈھکے اس ایک کمرے کے اندر تک آتی تھی جس میں کتابوں کے ڈھیر تھے، قدیم کھنڈروں میں سے جمع کردہ مٹکے، چوڑیوں کے ٹکڑے، سٹکے اور دھرتی ماتا کے مٹی کے شکستہ مجسمے تھے، جس میں برمانی اپنے آبائی گھر سے اپنے خاندان سے الگ... رہتا تھا۔ اور وہ تنہا نہیں رہتا تھا۔ ایک چھوٹی سی چوہیا جب وہ نیند میں ہوتا تو اس کی انگلیوں کی پوروں اور ناک پر اپنا بے دانت منہ رکھ کر انہیں چبانے کی کوشش کرتی اور وہ بے دھیانی میں اور نیند میں کروٹ بدلتا تو چوہیا بمشکل اپنے آپ کو بچا کر ذرا الگ ہو کر دھک جاتی اور ایک اور موقع کا انتظار کرنے لگتی.. اوپر چھت کے کڑیوں میں ایک بے ضرر سانپ کا بسیرا تھا جو زیادہ تر اپنے آپ کو پوشیدہ ہی رکھتا۔ صرف سال میں ایک بار اس کی کینٹیلی یہ ظاہر کرتی کہ وہ ابھی تک وہاں ہے.. اور برمانی ایک چوہیا اور ایک سانپ کے ہمراہ اپنے بیوی بچوں کی نسبت زیادہ

ہم آہستگی سے رہتا تھا اور اس نے کبھی بھی انہیں کوئی گزند پہنچانے کا سوچا بھی نہ تھا۔
برمانی دراصل اس کے آوارہ گرد باپ کا ایک تسلسل تھا۔

وہ عمر میں اس سے کہیں... بلکہ بہت پیچھے تھا... لیکن وہ ایک بزرگ کی طرح اس کی تعظیم کرتا تھا۔ اس میں وہ اپنے آوارہ خصلت باپ کی پرچھائیاں دیکھتا تھا۔ یہ پرچھائیاں اس کے بدن پر پڑتیں تو وہ پھر سے بچپن کی جانب لوٹ جاتا۔ شاید یہی اُن کی دوستی کی بنیاد تھی۔
برمانی بھی اپنی روزمرہ کی آسودگی اور تہذیب یافتہ زندگی سے یکدم خارج ہو کر غائب ہو جاتا۔ اس کے بال بچوں اور ماں باپ کے ماتھوں پر صرف ایک سلوٹ ابھرتی اور وہ اس کی گمشدگی سے سمجھوتہ کر کے پھر سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں الجھ جاتے۔ اس کے دوست اسے ملنے کے لیے کھینچ نکلتے اور کمرے کا دروازہ مقفل پا کر جان جاتے کہ دیوانگی اسے کسی اور صحرائیں لے گئی ہے۔

اس کی گمشدگی کا سب سے زیادہ تعلق اس چوبیا اور سانپ کو ہوتا۔ وہ اس کی غیر موجودگی سے بہت دکھی اور بے حد تنہا ہو جاتے۔ ان انسانوں کی نسبت جو اس کے رشتے میں تھے وہ اس کی غیر حاضری کو زیادہ محسوس کرتے۔

چوبیا اس کے خالی بستر کے قریب اپنا بے دانت منہ چلاتی رہتی اور شہتیروں میں لہرا کر نالہ کرتا اور سانپ کچھ روز کے لیے اپنی کیچلی اتارنے کا ارادہ ترک کر دیتا۔
پھر کسی شام دُھول میں اٹا ہوا بڑھی ہوئی دائرہ سی اور سرخ آنکھوں میں دیوانگی سفر کے آثار لیے برمانی واپس آ جاتا مگر گھر کی بجائے اپنے کھینچ میں آکر سو جاتا۔ اور کئی روز بعد گھر والوں کو خبر ہوتی کہ وہ واپس آ چکا ہے۔

برمانی نے ہی اس کی اس آب ووردی کا بندوبست کیا تھا۔
دونوں میں تنہائی قدر مشترک تھی۔

وہ بال بچوں کے باوجود الگ تھا۔ اور اُسے زندگی کے نشیب و فراز اور عمر کے بہاؤ سے تنہائی کے جزیرے پر لاپہنجکا تھا۔ نہ برمانی اپنے اکلایے کے ڈیرے سے باہر قدم رکھنا چاہتا تھا اور نہ ہی وہ اس جزیرے کی قید سے رہا ہونے کے لیے کسی کشتی کی خواہش کرتا تھا۔ یہ کہانی مذہب نہ تھی ان کی خصلت تھی جو رخصت نہ ہو سکتی تھی۔

”بکڑی سائیں...“

یکدم مرغابی کے پنجوں ایسے پاؤں رُکے، ان کے اوپر کا دھڑ جھکا اور سرور کا سیاہ مہاندرہ اس کے عین سامنے نمودار ہو گیا..

”بکڑی؟“

”مرغابی سائیں...“... اور یہ لفظ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں جل انھیں روشن ہو گئیں.. اس کے بقیہ وجود سے الگ ہو کر دیکھنے لگیں۔

”آؤ سائیں.. باہر آؤ“ سرور نے ہاتھ آگے کر دیا..

اس کا ہاتھ تمام اس نے کشتی کے ڈولتے ہوئے کنارے پر قدم رکھا اور قدرے مشقت سے کہ لیئے رہنے سے اس کے بدن میں جو تھوڑی بہت چمک باقی تھی وہ بھی جامد ہو چکی تھی، وہ باہر آ گیا.. سرور نے اس کا ہاتھ تب تک نہ چھوڑا جب تک وہ کشتی کے اگلے حصے کے تختوں پر نہ آ گیا.. دھوپ میں جو تیزی تھی وہ رخصت تو ہو چکی تھی لیکن کشتی کے اندرون کی عافیت بھری چھاؤں کے بعد اب اسے پوری آنکھیں کھول کر دیکھنا دشوار لگ رہا تھا..

پکھلی نے سر اٹھا کر اسے نظر بھر کر دیکھا.. اس کا بچہ دودھ سے سیراب ہو کر کشتی کے خالی تختوں پر اوندھا پڑا سو رہا تھا پر اس نے اپنا جھگانچے نہیں کیا تھا.. صاحب کو فریب دینے کے لیے نہیں.. بلکہ سندھ سائیں کی پُرہم ہوا کی ٹھنڈک کو اپنے تن پر ہولے سے چلتے جانے کے لیے.. لیکن صاحب اس کی موجودگی سے غافل رہا۔

پکھلی نے دل ہی دل میں اسے ”ماں چو..“ کی گالی دی اور جھگانچے کر لیا.. کشتی رُکی ہوئی تھی..

اگر وہ پکھلی کے وجود سے غافل تھا تو سرور ان سب کے.. صاحب کے.. پکھلی اور ماں جعفر کے اور اپنے وجود سے بھی غافل تھا.. اس کی آنکھوں میں بکڑی کے الاؤ جلتے تھے..

اس نے تریپال کے نیچے سے لکڑی کی ایک ٹکٹی سی نکالی، ایک صلیب نما شے... اس میں ایک کار توں پھنسا یا پھر اس کے اوپر اپنی پرانی بندوق رکھی، ایک چاقو کھول کر اس کے بلیڈ کو زبان پر پھیر کر اس کی تیزی کی تسلی کرنے کے بعد اسے منہ میں دانتوں تلے دبا.. اور

پھر اس ٹنگی کو پانی میں ڈال کر بہت آہستگی سے خود بھی اتر گیا۔ اسے اپنے آگے آگے دھکیلتا تیرتا اپنے دھڑکوپانی میں ڈبو کر صرف اپنا سر سطح کے اوپر رکھتا دھیرے دھیرے اُدھر حرکت کرنے لگا جدھر کڑی تھی۔

اماں جعفر بھی اپنے بھانجے کے ہمراہ برابر تیرتا تھا۔ وہ اگرچہ خاور کے برابر میں کھڑا سرور کو پانیوں میں تقریباً روپوش۔ ٹنگی کو ایک اُصال کی طرح ایک نقاب کی مانند دھکیلتا دیکھتا تھا لیکن اس کی آنکھیں بھی بھڑک رہی تھیں اور وہ بھی جیسے سرور کے ساتھ تیرتا جاتا تھا۔
”یہ ایسا کیوں کرتا ہے جعفر؟“

اماں جعفر نے اپنی توجہ کو ایک لمحے کے لیے ٹوٹنے نہ دیا۔ سرور پر نظر رکھے اُس کے وجود سے غافل وہ بولا ”یہ کڑی کا تولا ہے سائیں۔ جس کے پیچھے پیچھے سرور تیرتا ہے۔ مرغابی کے قریب جاتا ہے۔“

”مرغابی کدھر ہے؟“ اسے تو دور دور تک جہاں تک نظر جاتی تھی سوائے پانیوں کے اور کناروں کے اور سرکنڈوں اور سروٹوں کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
”تم تو دیکھتے ہی نہیں سائیں۔“ کبھی بولی ”تمہیں کیا نظر آئے گا۔ مرغابی اُدھر ہے جدھر کو سرور تیرتا کھڑا ہے۔ پر تمہیں نہیں دکھے گی۔ پر پانی کے پونج اُسے دیکھ لیتے ہیں۔“

”اُدھر ہے سائیں۔“ اماں جعفر نے کبھی کے لہجے کی تلخی کو محسوس کیا اور اس کی مدد کو آیا ”جدھر ٹاپو ہے پانیوں میں ابھرا ہوا۔ اس پر ہے۔ دو ہیں۔ ایک کڑی ہے اور دوسری بوہلے ہے جو پوشلی ہلاتی رہتی ہے۔ دیکھتے ہو؟“
”نہیں۔۔۔“

اس کی اور ان کی نظر میں فرق تھا۔

اسے وہ پانیوں میں ابھرا ہوا ریتلا ٹاپو جس پر چند جھاڑیاں اور کہیں کہیں گھاس کے ٹکے تھے مشکل سے دکھائی دیتا تھا اور اس پر کوئی اور شے نہ تھی۔ اور اس کی جانب سرور اپنے توالے کو دھکیلتا اتنی دور ہو چکا تھا کہ وہ یہاں سے دکھائی یوں دیتا تھا جیسے سندھ کے پانیوں میں ایک بے جان بے ضرر جھاڑی ہے جو بہتی ہوئی جا رہی ہے۔

بہاؤ کے زور میں.. اس کے ساتھ.. آہستگی سے ایک اور جھاڑی جو کبھی کناروں پر اپنی جڑیں گہری کیے سندھ سائیں کو تکلتی تھی اور پھر اس کے پانیوں نے اس کی بنیاد کو ہلا کر اسے اپنے آپ میں بے بس اور بے اختیار کر کے شامل کر لیا.. ایک اور جھاڑی بے جان اور بے ضرر بہتی ہوئی جا رہی تھی... اور یہی فریب تھا کسی بھی پکھیر کے لیے.. کہ یہ تو ایک اور جھاڑی ہے جو بہتی ہوئی میری جانب چلی آتی ہے... نہ اس پر کوئی شت لگائے پرانی بندوق ہے جس کی نالی کا رخ اس کی جانب ہے.. نہ کوئی کار تو اس میں پوشیدہ ہے اور نہ ہی اس کے عقب میں کوئی ایسی سیاہی چھپی ہے جس کی آنکھیں بھڑکتی ہیں اور اس کے دانتوں میں اس کی گردن پر پھیرا جانے والا ایک چاقو بھنچا ہوا ہے.. اور یہی وہ فریب کا جال تھا جو بے جان اور بے ضرر دکھائی دیتا اس کی جانب بڑھتا آتا تھا.. ایک اور جھاڑی تھی..

اُسے.. خاور کو پہلی بار احساس ہوا کہ دراصل کیا صورت حال ہے.. تو لے کو ڈھال بنا کر اپنے آپ کو پوشیدہ رکھتے ہوئے سرور کے دل میں ایک قتل کا منصوبہ تیرتا ہے.. "یہ... مرغابیوں کو مارنے گیا ہے جعفر؟"

اماں جعفر اس سوال سے اپنے سحر انگیز مگڑی کے جادو میں مبتلا سکوت میں سے یکدم باہر آیا اور سر ہلا کر کہنے لگا "مرغابی ہوتی کس لیے ہے سائیں.. ہم مہانے جو ہوتے ہیں تو ہم سندھ کا پونگ ہیں سائیں.. مچھلی کے بچے سمجھتے ہوں ناں صاحب.. تو سندھ سائیں ہمارا اُن داتا ہے.. رزق دیتا ہے سائیں.. ہمارے اُن پانی کا بندوبست کرتا ہے.. تو یہی ہمارا اُن پانی ہے سائیں.. مرغابیاں، جل مگڑی، سرخاب، منگھ اور مچھلی.. یہی رزق ہے ہمارا... سرور جاتا ہے تو مرغابی کی چونچ دیکھنے کو تو نہیں جاتا ان ڈونگے اور ٹھنڈے سیٹ پانیوں میں.. اُس کے ماس کی گرمی کو اپنے لیے گھیرنے کو جاتا ہے.."

سندھ کی آبی چادر کے تناؤ میں... ذہنی دھوپ میں پچھی ہوئی چادر میں صرف ایک جھاڑی بہتی ہوئی اُس ٹاپو کے قریب ہوئی جو اسے مشکل سے دکھائی دیتا تھا.. پھر ایک ہلکی سی گونج سنائی دی.. ایک مدھم سے فائر کی آواز بہت دبی دبی پانیوں پر تیرتی اس کے کانوں تک آئی اور اسی لمحے اس نے دیکھا کہ ٹاپو کی ریت سے.. چند جھاڑیوں اور گھاس کے ٹکڑوں کے درمیان میں سے دو سیاہ دھبے سے اٹھتے ہیں اور پھر پھرتے ہوئے سندھ کی آبی چادر پر بلند ہوتے ہیں..

”ماں چو...“ کبھی زیر لب بڑبڑائی..

اماں جعفر نے غصے میں آکر اپنی منحنی ران پر ہاتھ مارا لیکن کچھ نہ کہا..
وہ جھاڑی کچھ دیر ناپو کے قریب رکی رہی، سکتے میں آئی رہی اور پھر رخ بدل کر
کشتی کی جانب لوٹنے لگی.. لیکن اب وہ بہت تیزی اور شتابی سے واپس آرہی تھی.. ان کے
قریب ہوتی گئی..

سرور اپنے تولے کو دھکیلتا، کھیتا ہوا، کشتی سے آگیا..

”نکل گئی بہن چو...“ سرور پانی سے باہر آیا تو وہ بری طرح کانپ رہا تھا.. اس کی
ہتیس اس کے بس میں نہ تھی اور کٹ کٹ بے اختیار بجتی جاتی تھی... جیسے اسے نمویے کی
کھنی چڑھ گئی ہو.. اس نے لرزتے ہاتھوں سے تولے کو پانی سے نکالا، چا تو جو اس کے دانتوں کا
ایک حصہ بن چکا تھا اسے کھینچ کر منہ سے نکال کر کشتی کے عرشے پر پھینکا... فالٹو کار توں اور
ہندو کو تولے سے جدا کر کے اسے پھر سے ترپال کے نیچے گھسیڑ دیا اور پھر ہانپنے لگا ”صاحب
بڑے وزن والا اور چربی دار گوشت تھا نکڑی کا.. اڑی ہے تو مشکل سے اپنا بوجھ سہارتی
تھی.. نکل گئی بہن چو...“

”سرور...“

”جی سائیں..“

”پرندہ نہیں مارنا.. آئندہ!“

”ہیں؟“

”مرغابی پر فائر نہیں کرنا.. آئندہ!“

”پر کیوں سائیں؟“

”اس لیے کہ کسی ایک مرغابی کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں“

وہ جھکا اور پھر کشتی کے اندر چلا گیا..

”کیسا ماں چو.. صاحب ہے.. پرندہ نہیں مارنا کہتا ہے.. مرغابی پر فائر نہیں کھولنا کہتا

ہے...“ سرور بڑبڑاتا گیا اور ٹھنڈا مارا ہوا ٹھنڈا گیا.. وہ اب اس لائق نہ رہا تھا کہ کشتی کو کھے

سکا.. چنانچہ اماں جعفر نے بانس تھا اور تہہ کی کھوج میں اسے پانیوں میں ڈبو تا گیا..

تھوڑی دیر بعد وہ اماں جعفر کے دوپاؤں کشتی کے چوہی کناروں پر دوڑتے ہوئے

دیکھ رہا تھا اور کشتی ہو لے ہو لے آگے ہوتی جاتی تھی۔

وڈیرے سائیں تو اس کی چھاتیوں کو دیکھ کر ہونٹ گیلے کرتے تھے اور یہ اس کی جانب دیکھتا تک نہیں تھا... پکھی نے مایوسی میں سر ہلایا۔

پچھلی شب بے خوابی میں گزری تھی..

برمانی کے سنج میں پچھلی شب بے خوابی میں گزری تھی..

اس لیے کہ وہاں وہ چوہیا تھی.. وہ ایک چوہیا رات بھر پریشان رہی تھی کہ یہ ناک جسے میں کترنے کی کوشش کرتی ہوں وہ ناک نہیں ہے جسے میں ہر رات کترنے کی کوشش کرتی ہوں اور یہ پاؤں بھی نہیں جن کی انگلیوں پر میں اپنا منہ چلاتی ہوں.. تو یہ ناک اور یہ پاؤں کی انگلیاں کس کی ہیں اور یہ کون ہے.. وہ جاگتا رہا تھا.. اس چوہیا کو بھگانے کی کوشش کرتا رہا تھا... پر وہ کہاں جاتی.. وہ اپنے گھر میں تھی اور وہ نہ تھا..

کشتی کے ہچکولے ایک ہموار تسلسل کے ساتھ اس کے پونے بھاری کرنے لگے.. اور وہ اونگھنے لگا.. گدوں کی بدبو اور پانی کی نمی کی عادت اس کی ناک کو ہوتی جاتی تھی... وہ اونگھنے لگا... بدن کیوں ساتھ نہیں دیتا زوال آتا ہے تو اسے قبول کرنے کا شعور اس کے ساتھ کیوں نہیں آتا... اعضاء کیوں بیگانے سے ہو جاتے ہیں.. ان کا توازن کہاں گم ہو جاتا ہے.. ساٹھ برس کی عمر تو کوئی عمر نہیں ہوتی.. یا ہوتی ہے.. اگر ہوتی ہے تو پھر ایک فل سناپ آنا چاہئے کہ بس یہاں تمہارا نکٹ ختم ہوتا ہے، یہی تمہاری حد ہے.. اتر جاؤ.. تم آگے نہیں جاسکتے.. پر کوئی نہیں روکتا.. آگے جاتے ہیں تو چلنا پھرنا دو بھر ہونے لگتا ہے.. اپنے ہاتھ پاؤں پرائے ہونے لگتے ہیں کہا نہیں مانتے.. میٹرھیوں کی بجائے قدم لفٹ کی جانب جاتے ہیں.. دوسروں کے بدن کی پھرتی اور بے پروائی زہر لگتی ہے.. ڈاکٹر طاہر نے کیا کہا تھا.. یوہیوٹو لوڈاٹ... توازن ہمیشہ کے لیے برقرار نہیں رہتا.. یہ ڈول گیا ہے تو اب کبھی درست نہیں ہوگا.. جو دریں بے وجہ تمہارے بدن میں اٹھتی ہیں ان کے ہمراہ ہنسیکھ لو.. یہ اب کہیں نہیں جائیں گی.. تم چلے جاؤ گے.. پاپا ہیمنگوے نے درست کہا تھا کہ جب ایک مرد کے رس کی روانی ختم جائے تو اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہوتا.. اگرچہ وہ مکمل طور پر ختم تو نہیں تھے لیکن ان کی روانی میں خلل پیدا ہو گیا تھا..

جعفر کے دونوں پاؤں کشتی کے فٹ پاتھ پر دوڑتے جاتے تھے اور ہانس تہہ کی

حلاش میں ڈوبتا جاتا تھا..

اور کشتی پانیوں کی وسیع گود میں ہمسکتی ہوئی 'ملاپ کی سرخوشی میں مست ہوتی..
بہتی چلی جاتی تھی۔

کچھی اپنے بھاری کولہوں پر براجمان ڈھلتے سورج میں تھی اور بچہ گہری نیند میں

تھا..

مدتیں گزر گئیں اور پھر ایک شدید دھچکے نے اسے بیدار کر دیا.. سکوت تھا.. ہر
شے ٹھہراؤ میں تھی.. مدھم دھوپ اندر آتی تھی اور کشتی کے کنارے جعفر کے پاؤں سے خالی
تھے.. اس کی آنکھوں میں نیند سرخ ہوتی تھی..

اس نے کھدیاں کشتی کے فرش پر بکا کر اپنے آپ کو اونچا کیا اور باہر نظر
کی.. سندھ کے پانی نہایت مدھم اور کومل سروں میں بہہ رہے تھے.. کشتی ایک بلند ریٹلی
ڈھلوان سے اپنی چھاتی لگائے آہستہ آہستہ ڈول رہی تھی..

وہ اپنے نیم خوابیدہ وجود کی مستی میں ڈولتا باہر آگیا..

کوئی ناپو تھا.. پانیوں کے درمیان میں..

کشتی سے ذرا فاصلے پر سرور پانیوں پر شست لگائے بت بنا بیٹھا تھا..

دریا کے کنارے ایک ٹکڑے جال کو دونوں ہاتھوں سے اٹھائے وہ پانی پر نظریں
جمائے ایک سحر زدہ ساپ کی طرح دم رو کے بیٹھا تھا..

جال کے سوراخوں میں سے مدھم دھوپ کسماتی ہوئی نکلتی تھی..

"ادھر رات کریں گے صاحب... " ماہاں جعفر جو کشتی کھینے کی مشقت سے ذرا
برے حالوں میں تھا سانس اندر کھینچ کر بولا اور اس کے مان جانے کے انتظار میں رہا پھر
قریب آگیا "ابھی روشنائی ہے.. کشتی سے سامان اتارنے" تنبو لگانے اور روٹی پانی بنانے میں
مصیبت نہیں ہوگی.. ابھی اور آگے گئے تو رات ہو جائے گی.."

اس نے سر ہلایا اور کشتی سے اتر کر... نیچے ریت کناروں پر گیلی تھی جس میں اس
کے جو گر ٹخنوں تک دھنسن گئے.. کشتی سے اتر کر ڈوبتے سورج کی جانب چلنے لگا جہاں سرور
دھونی رمائے اپنے گیان دھیان میں گم بیٹھا تھا..

وہ دم رو کے بیٹھا تھا.. پانی سے نظر نہ ہٹاتا تھا.. وہ اس کے قریب ہوا تو بھی اس

نے آنکھ اٹھا کر اس کی جانب نہ دیکھا.. وہ پانیوں کا بوگئی اپنے آپ میں گم رہا.. خاور نے بھی کچھ نہ کہا اور اسے دیکھتا رہا.. اور پھر بہت دیر بعد وہ بولا تو بھی اس کی جانب نگاہ نہ کی۔
 ”مل گیا تو شکار نہیں تو بریکار...“

اس نے اپنے جو گرا اتارے اور سرور کے برابر میں بیٹھ گیا.. ننگے تلووں تلے ریت کے ذرے ٹھنڈک میں تھے اور پاؤں کو ایک جُپ سکھ سے آشنا کرتے ٹھرتے جاتے تھے ”کچھ ہاتھ آیا؟“

”صاحب آپ نے پرندوں کی منہائی کر دی ہے.. مچھلی کی تو نہیں..“
 ”نہیں..“

”ابھی تو دیدار نہیں ہوا“

”دم رو کے ہوئے بیٹھے ہو..“

”ہاں سائیں.. کسی کا دم روکنے کے لیے اپنا دم بھی روکنا پڑتا ہے.. مچھلی کو تو آنکھیں جھپکنے سے خبر ہو جاتی ہے کہ سر پر شکاری ہے جو سانس لیتا ہے..“ وہ سرگوشی میں پانی پر سے نظریں بنائے بغیر بولتا رہا..

”تمہیں دکھائی دے جائے گا جب پانی میں بھی تیرتی ہوئی آئے گی؟“

”نہ سائیں.. سندھ سائیں کے پانی گدے ہیں ان میں کچھ بھی دکھائی نہیں

دیتا..“

”تو پھر کیسے جان جاؤ گے؟“

”پانی پر آنکھیں رکھتے ہیں ناں سائیں.. نال پر بلبلے اٹھتے ہیں جدھر سے وہ دیدار کروانے والی معشوق آتی ہے.. پانی میں بلبلے تو جنتے رہتے ہیں پر سائیں مچھلی کے سانس کا بلبلہ الگ ہوتا ہے.. ہم جانوں ہیں کہ مچھلی کے ہر سانس کے درمیان کتنا وقت ہوتا ہے اور جب اس حساب سے پانیوں پر بلبلے ظاہر ہوتے ہیں تو ہم پہچان جاتے ہیں.. اور پھر اس مقام پر جال ڈال دیتے ہیں...“

یہ خاموشی مقدس تھی.. اس میں بولنا گناہ تھا..

وہ پہلی بار کشتی سے الگ ہو کر اسے دور سے دیکھ رہا تھا.. رینگنے ناپو کے ساتھ اپنا وجود جوڑے وہ پانیوں کی عظیم وسعت میں حیران اور گمشدہ تھی اور اس کے باوجود اس کا مختصر

وجود ہی اس تقابل کو جنم دیتا تھا جس کی خیرات سے منظر تاحد منظر پھیلتا اور وسیع ہوتا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی جھاڑی تھی جس کی وجہ سے صحرا کی عظمت کا اندازہ ہوتا تھا۔

”میرا خیال تھا کہ تم لوگ بس پانیوں میں ہاتھ ڈالتے ہو تو مچھلی گرفت میں آجاتی

ہے۔“

”جیسے ہم لمہانے یہ سوچتے ہیں کہ آپ سائیں کے لیے موٹریں اور بنگلے تیار ملتے ہیں... آپ کوئی کام کاج نہیں کرتے اور یہ تیار ملتے ہیں... رزق ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ میں تو نہیں آجاتا سائیں... پسینہ بہتا ہے اور محنت ہوتی ہے تو مچھلی ہاتھ میں آتی ہے... پر آج دیری ہو گئی ہے... رات دکھن کی ہوا چلی تھی سائیں اس لیے مچھلی نیچے گہرے پانی میں چلی گئی ہے... پر اپنے پونگ کے پیچھے آئے گی... ایک بھی نظر آگئی تو ہماری ہوگی...“

وہ پھر سانس روک کر بیٹھ رہے۔

سرور بہت دیر دھونی رمائے دم سادھے بیٹھا رہا لیکن اس کی نظروں کی تاک میں آئے سندھ کے پانیوں پر کسی مچھلی کے سانس کا بلبلانہ اٹھا۔

جعفر کو وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ ہولے ہولے کشتی میں سے سامان نکال کر ریت پر ڈھیر کر رہا تھا۔ کبھی اپنے سدا کے بھوکے اور ندیدے بچے کو اپنی چھاتیوں میں پناہ دیئے ریت پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔

یہ تنہائی اور ریت اور پانی کی ایک ایسی کائنات تھی... ڈھلتے سورج میں ڈھلتی ایک ایسی کائنات تھی جس میں صرف وہ ایک کشتی تھی جو انہیں اس کائنات میں لے آئی تھی اور صرف وہ تھے... سرور کے اٹھے ہوئے ہاتھوں میں منتظر ٹکونا جال... جعفر، کبھی اور وہ... اور اس کے ریت پر پڑے... اوندھے پڑے جو گر شوز...

دھوپ سے خالی ہوتے آسمان میں پرندوں کی ایک ڈار نمودار ہوئی... بہت بلندی

پر...

سرور نے پہلی بار پانی سے نظریں ہٹائیں اور اوپر نگاہ کی... ”سائیں آپ بہت دیر سے آئے ہو... ان رُتوں میں یہ ماں چو... نیچے نہیں اترتیں... یہ اپنے دیسوں کو لوٹ رہی ہیں۔“

وہ جانے کو نجیں تھیں ’مرغابیاں تھیں یا سرخاؤں کے غول تھے آسمان پر ایک لہ

نمودار ہوئے اور دوسرے لمحے آسمان خالی ہو گیا.. اپنے دیسوں کو لوٹنے والے ہمیشہ شتابی میں ہوتے ہیں، رکتے نہیں۔

وہ بیٹھے رہے..

آخر کار سرور کی برداشت جواب دے گئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا ”مل گیا تو شکار.. نہیں تو بیکار... تو سائیں آج تو سب بیکار“

سندھ کے پانیوں پر اُتری گھنیری گھپ رات میں..

پانیوں کی بے آواز سیاہ چادر پر ستارے اُترتے تھے.. اس پر بجھے ہوئے تھے اور یہ ستارے اس پر... جہاں تہاں وہ چادر پھلتی تھی... ناپوؤں اور جزیروں کے اندر تک جاتی تھی وہاں تک وہ اس پر.. جو ستارے تھے.. اس پر دوپٹے پر ناکی مکیش کی مانند ٹمٹماتے جاتے تھے.. یہ ڈوبتے تھے اور ابھرتے تھے اور ان پر سرور کی پرات کی جھنجھٹائی چھٹک اور ماماں جعفر کے منکے کے منہ پر بندھے ململ کے کپڑے پر جھائی گئی آنے کی تہہ پر پڑتی تھا پ کی تال تیرتی جاتی تھی... اور کہیں سندھ کے پانیوں میں اُترے ہوئے کسی ستارے پر اُس تال کا بوجھ پڑتا تھا تو وہ پانی میں ڈوب جاتا تھا اور کہیں وہی چھٹک اور تال کسی ستارے کی لُو بڑھادی تھی... اور جب یہ لُو بڑھتی تھی اور پانی پر روشنی بکھیرتی ہوئی اُس ریتلے ناپو تک پہنچتی تھی جہاں سے یہ مدھر تال آتی تھی تو وہاں وہ کیا دیکھتی تھی... اسے ناپو تو دکھائی نہیں دیتا تھا گھنیری رات میں صرف گھپ اندھیرے کے بیچ میں بھڑکتے الاؤ کے گرد سرور دکھائی دیتا تھا جس کا سیاہ پنہ سینے میں بھینکتا تھا اور آگ کی روشنی میں وہ پسینہ لشکناؤ کہیں مارتا تھا اور اُس کا ایک قطرہ.. ایک بوند اس پرات کی پشت پر گرتا تھا جس پر سرور کے مرغابی کے بچوں ایسے ہاتھ اتنی تیزی سے تھا پ دیتے حرکت کرتے تھے کہ وہ دو نہیں درجنوں لگتے تھے... وحشیانہ انداز میں متحرک پرات کو تیزی سے تھپکتے ہوئے اور اس پرات میں سے ایک دل پذیر حال ڈالتی بے خود کھٹک دار روہم تاریکی میں چھٹکتی ہوئی بکھرتی تھی۔

ماماں جعفر اس کے برابر میں سرنگوں اپنے منکے کے ٹنگ دہانے پر جھکا اس پر یوں تھا پ دیتا تھا کہ ایک گھنی طبلہ نما گہری گونج دھڑکتے دل کی طرح دھک دھک کرتی اٹھتی تھی اور عرش پر دستکیں دیتی تھی۔

کبھی الاؤ سے ذرا ہٹ کر ریت میں دھنسی بیٹھی تھی اور الاؤ کی جتنی روشن بھڑک اس تک پہنچتی تھی اس کے چہرے مہرے پر پھیلتی اس کی تاریک آنکھوں میں جاذب ہوتی تھی اور انہیں اندھیرے میں غیر مرئی طور پر چمکتی دکھتی کسی بلی کی آنکھوں ایسا کرتی تھی... وہ خود کم دکھائی دیتی تھی پر اس کی آنکھیں ٹاپو کی تاریکی کے اوپر معلق جلتی بھڑکتی دکھائی دیتی تھیں..

اور صاحب تھا.. جو اس منظر میں بے جواز تھا..

اس کائنات کا نہ تھا.. کسی اور سیارے سے اترا ہوا بے جوڑ اجنبی تھا اور اس منظر میں ایک بیوند لگتا تھا..

ستارے کی ٹوہرے سب کچھ دیکھ کر انہی قدموں پر پانیوں پر لٹکتی واپس چلی جاتی تھی..

ملاحا ہالی نہ بیڑی ٹھیل ساہڈے یار و نجنا...

اماں اور بھانجرا دونوں اپنے چنے سفید دانت گھور اندھیرے میں لٹکتے جڑے وہاں تک کھولے جہاں تک ان کے گلے کی گھنڈی تھر تھراتی نظر آتی تھی... منہ پھاڑے گا رہے تھے اور اپنے مہانے ساز... پر ات اور ملکا بجا رہے تھے.. بے خود اور مست اُن پر جھکے ہوئے تھے اور گارہے تھے.. ملاحا... حا... حا... وہ حا حا کو طول دیتے چلے جاتے اور پھر یکدم سر جھکا کر اپنے منکے اور پر ات کو پینے لگتے... بیدردی سے مگر سر کے اور تال کے اندر اندر... ہالی نہ بیڑی ٹھیل ساہڈے یار و نجنا.. یار ملاحا بھی کشتی کو سندھ سائیں کے پانیوں پر رواں نہ کرنا کہ ابھی تو میرے یار نے بھی پار جانا ہے...

خاور ریت پر بچھے اپنے سلیپنگ بیگ پر گوٹھ مارے بیٹھا نیند سے بے بس ہوتا ڈھے رہا تھا.. اسے اس چوہیا نے کچھلی شب سونے نہ دیا تھا.. یہ مہانے بھی بے مہار ہوتے تھے اور اسے سونے نہ دیتے تھے.. ان کے چہرے الاؤ کے مقابل جیسے تیل سے پوچے ہوئے ہوں یوں لٹکتے تھے.. جیسے وہ کوئی افریقین جادوگر طبیب ہوں اور اپنے پرکھوں کی روحوں کو بلانے کے لیے گلے پھاڑ پھاڑ کر ایک بے اختیار روحانی کرب میں مبتلا گاتے جا رہے ہوں... ان کی لے میں بھی ایک قدیم.. جان بوجھ کی سلطنت سے پرے کا خوف تھا جو تاریکی میں ڈوبے سر کندوں میں سے سرسراتا آتا تھا اور پھر ان کے ہاتھوں کے راستے ان کے

خود ساختہ سازوں میں منتقل ہوتا تھا۔

گنبد نما خیمہ جو خاور کا مسکن تھا اس میں تھک سے اتنا پرے تھا کہ نظر وہاں تک جاتے جاتے تاریک ہو جاتی تھی۔

اُس کے ذہن میں اس آبی سفر کا جو تخیل تھا اس میں ایک ست روی تھی پانیوں پر بلکورے لیتی ہوئی اور پھر تباہ اور انگ تھک راتیں تھیں۔۔۔ مہانوں کے لشکے ہوئے مہاند رے اور پکھی کے چوڑے کو لے اور اس قسم کی موسیقی سے دھڑکتی ہوئی راتیں نہ تھیں۔۔۔ آج شکار نہیں ملا تھا اور ان کے لیے سب بیکار ہو گیا تھا۔

شادی اتے بچناں دی تاہنگ رہندی اے

شادی تے تیار اے دل دار بچناں... ملا... ملا... جا... جا... ہائی نہ بیڑی ٹھیل...

جو خود ملاج تھے وہ بھی ملاج کی خدمت میں درخواست گزار رہے تھے کہ ابھی تو کشتی کو نہ ٹھیلنا۔۔۔ ساڑھے پارہ بچناں۔۔۔

تاریکی اترنے سے پیشتر انہوں نے سامان کشتی میں سے اتار لیا تھا۔

تال تیرتی تھی پانیوں پر جلتے ستاروں کو بجھاتی تھی... پھر جلاتی تھی۔

تاریکی اتری تو ان کا چوہا لہار و شن ہو چکا تھا اور دیکھی میں برمانی کے ڈیرے پر آج صبح تک کڑکڑاتی مرغی دیکھی تھی... جو جل اٹھا تھا یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتی تھی... لیکن ڈوکی پر بند مٹھی پکھی کی نہ تھی سرور کی تھی... کھانے سے فارغ ہو کر گویا وہ صاحب کی غلامی سے آزاد ہو گئے تھے اس کے ساتھ مکمل غفلت برتتے وہ اٹھے 'سرور اور جعفر... اور ٹاپو کے ایک ریتلے نیلے پر جا بیٹھے اور تھوڑی دیر بعد اوھر سے گھنگھر وں کے چھن چھن کی آواز ایک تسلسل کے ساتھ آنے لگی تھی... وہ دونوں بڑی خاموشی سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے اور سرور نے د 'وری کو تھام رکھا تھا اور اماں جعفر ڈنڈے سے اس کے اندر جو بوٹی تھی اسے گھونٹا جاتا تھا... ڈنڈے کے اوپر گھنگھر دہندھے تھے اور وہ اماں کے تجربہ کار ہاتھوں کے تحرک کے ساتھ چھن چھن بچتے تھے۔

بوٹی تیار ہونے پر وہ اپنے نیلے سے اتر کر اس کے پاس آئے "سائیں بوٹی پو گے؟"

"نہیں... تم بڑے"

"سائیں جس آجائے گی ایک گھونٹ تو بھرو... سندھ سائیں کے بیلوں میں اگنے"

والی خاص بوٹی ہے... اندر جاتی ہے تو مشک پھا دیتی ہے۔“
”نہیں...“

اور اب بوٹی نے ان کے اندر مشک پھا رکھا تھا اور وہ اپنی اپنی تال کی دھمک میں ڈوبتے جھومتے اور گن گنت تھے پر ایک بھی ہاتھ بے سُر نہیں پڑتا تھا۔
الاؤ کے گرد خاور سرد اور جعفر ایک چھوٹی سی روشن پر شور دھکتی ہوئی کائنات تھے اور ان کے چار پھیرے اگرچہ سندھ تھا اس کے جنگل نیلے اور آسمان تھا لیکن وہ سب رات کے بلیک ہول نے نگل لیے تھے۔ لیکن جب کبھی وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا تھا تو اس بلیک ہول میں اسے دو آنکھیں جلتی اور جھپکتی دکھائی دیتی تھیں۔ سندھ کے دوپٹے پر جو مکیش ٹمٹماتی تھی ان سے الگ ہوتی تھیں اور گن گنت تھیں اس یقین میں کہ ان کا جادو کونا کبھی نہ کبھی اثر کرے گا۔ وہ آنکھیں اس کی کمر میں چھید ڈالتی تھیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مڑ کر ادھر دیکھ لیتا تھا۔

سرد اور جعفر بے تکان تھے۔ ان کے اندر مشک پھاتی بوٹی ان کے ہاتھوں کی گردش اور گھلے کے لوچ میں ڈھلتی تھی۔ یکدم ان دونوں کے ہاتھ رک گئے۔ جہاں تھے وہیں ساکت ہو گئے اور جڑے کھلے کے کھلے رہ گئے اور آواز کا بہاؤ ختم گیا۔ گھپ اندھیری خاموشی اتری جس میں الاؤ میں جلتی شہنیوں کی انگارہ ٹوٹ پھوٹ اور سندھ کے پانیوں کی دھیمی سرسراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔

کنارے کے پانیوں پر موٹی موٹی آنکھیں رکھے کوئی مینڈک زور زور سے ٹرانے لگا۔

سرد نے اپنی پرات ریت پر اونڈھی کی اور کھڑا ہو گیا۔ اپنے پورے جتن کے ساتھ سننے لگا اور پھر سندھ کے مکیش ناکے دوپٹے کی جانب اشارہ کر کے کہنے لگا ”ادھر تو نہیم آیا کھڑا ہے سائیں۔“

”کون؟“ وہ پرات اور منکے کی تال کے یکنخت ٹوٹنے اور خاموشی کے گرنے سے ابھی مفاہمت نہ کر پایا تھا۔
”نہیم سائیں“

اس نے اپنے آپ کو دھنستی ریت میں سے بمشکل الگ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اور

اسے بہت دقت ہوئی، گھٹنوں پر بہت زور پڑا۔ وہ اٹھا تو ان سالخورہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر سیدھا ہوا۔ ڈاکٹر ظاہر درست ہی کہتا تھا۔ تمہیں اپنے بدنی زوال سے سمجھوتہ کر لینا چاہئے۔ یو ہیو ٹولیو وواٹ!

”کون؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”آپ کا پاورچی سائیں۔ وہ آیا کھڑا ہے“

”کہاں آیا کھڑا ہے۔“ اس نے جھلا کر کہا کہ اس کے سامنے دور دور تک سندھ ساگر کی چادر پر جلتے بجتے بے انت دیئے تھے۔۔۔
”وہاں۔۔۔“

وہ دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے۔ مسکراتے کنارے کی طرف بڑھنے لگے اور وہ بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔

کنار پانی کی سطح سے خاصا بلند تھا۔ اور بھر بھرا تھا۔ اس لیے وہ ذرا ادھر رک گئے۔۔۔ وہ دونوں سامنے دیکھنے لگے اور وہ کچھ بھی دیکھتا نہ تھا اس لیے بے بسی سے سننے لگا۔ خاموشی میں کنارے کی ریت کا کوئی حصہ ڈھے جاتا اور اس سکوت میں جس میں دھیمی رواں سرسراہٹ تھی اور ایک مینڈک ٹراتا تھا وہ آرام کی سی ایک آواز آتی۔

وہاں جدھر وہ اشارے کرتے تھے وہاں پانیوں میں سوائے نیم تاریک ٹمٹماہٹ کے اور بے انت تاریکی کے اور کچھ نہ تھا۔ پر وہ ادھر دیکھتے تھے اور اشارے کرتے تھے۔

ایک طویل مدت کے بعد ریتلے اور اونچے کنارے کے عین نیچے گہرائی میں پانیوں کی سیاہ چادر میں سے ایک آسیب نما شے نمودار ہوئی، ہو لے ہو لے باہر آئی اور پھر نیچے سے ایک انسانی آواز آئی ”ہوئے سرور۔۔۔“

”ادھر اوپر آئے کھڑے ہیں سائیں۔“ سرور نے نہایت پر اشتیاق لہجے میں تاریکی کے اندر جھانکتے ہوئے آواز دی۔

”ہوئے فہیم۔۔۔“ جعفر بھی آگے ہو گیا۔

وہ آسیب پانیوں میں سے نکلا۔ اوپر دیکھا اور پھر بھر بھرے کنارے پر چڑھتا پلاسٹکس بھرتا اوپر ان تک آپہنچا۔

اس کے سر پر گٹھڑی تھی جسے اس نے ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔ وہ الف بگا تھا